باسمہ تعالیٰ

لمعات

(اسلام اور سیاسی پارٹیاں)

قارئینِ طلوعِ اسلام میں سے ایک صاحب لکھتے ہیں کہ آپ نے وحدتِ اُمّت کے حق میں اور فرقہ بندی اور تفرقہ انگیزی کے خلاف جو کچھ لکھا ہے وہ ایسا جامع اور اتنا مدلّل ہے کہ اس کے بعد اس حقیقت میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ اُمّت میں ہر قسم کا اختلاف اور افتراق خلافِ اسلام ہے۔ دین (اسلامی نظام) اور وحدتِ اُمّت لازم و ملزوم ہیں۔ لیکن اس کے باوجود، مروّجہ اسلام یا سیکولرازم کے حامی مسلمان اس حقیقت کے خلاف طرح طرح کے اعتراضات کرتے رہتے ہیں۔ اسی سلسلہ میں یہاں ایک صاحب فرماتے ہیں کہ کون کہتا ہے کہ اسلام میں سیاسی پارٹیوں کی اجازت نہیں۔ خود صحابہؓ میں سیاسی پارٹیاں موجود تھیں۔ مہاجرین اور انصار دو سیاسی پارٹیاں تھیں جنہوں نے اسی حیثیت سے، سقیفہ بنی سعد میں پہلا انتخاب لڑا تھا۔ یعنی حضرت ابوبکرؓ صدیق کا انتخاب۔ اس کے متعلق وضاحت مطلوب ہے۔

طلوعِ اسلام

ہم بھی عجیب "قسمت" لے کر آئے ہیں! ایسا نظر آتا ہے گویا (عوام کے الفاظ میں) ہمارے مقدّر میں یہ لکھا ہے کہ ہم عمر بھر اسلام کے مسلّمات اور بدیہیات کی مدافعت کرتے رہیں، اور دین کے ان اساسی اصولوں کے خلاف (جن کے واجب التسلیم ہونے میں کسی مسلمان کو شک و شبہ نہیں ہونا چاہیئے) خود مسلمانوں کی طرف سے اعتراضات کا جواب دیتے رہیں۔ تحریکِ پاکستان کے دوران، ہمارا سارا وقت اس بنیادی حقیقت کو "ثابت کرنے" میں صرف ہو گیا کہ دین کا تمکن صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ مسلمانوں کی اپنی آزاد مملکت ہو جس میں قرآن کریم کے احکام و اقدار، قانونِ مملکت کی حیثیت سے نافذ ہو سکیں۔ حصولِ پاکستان کے بعد اس مملکت کا قیام ہوا تو اس قسم کے سوالات ابھرنے شروع ہو گئے کہ اسلامی مملکت کسے کہتے ہیں۔ کسی مملکت کے آئین و قوانین کو اسلامی کس صورت میں کہا جا سکتا ہے؟ اسلامی حکومت اور سیکولر نظام میں فرق کیا ہے؟ ہمارے وقت اور توانائی کا بیشتر حصہ اسی قسم کے سوالات کے جواب دینے اور دین کے مسلّمات کو (گویا) ثابت کرنے میں صرف ہو گیا (اور ہو رہا ہے)۔ اعتراضات تو ہر قسم کے سامنے آتے رہتے ہیں، اور ہم ان کے خوگر بھی ہو چکے ہیں، لیکن یہ اعتراض (جس کی طرف شروع میں اشارہ کیا گیا ہے) نہ صرف

یہ کہ ہم نے پہلی بار سنا ہے بلکہ جہاں تک ہماری نگاہ ہماری یاوری کرتی ہے) ہماری تاریخ میں پہلی بار ایسا کہا گیا ہے کہ مہاجرین اور انصار دو سیاسی پارٹیاں تھیں! اس پر ہم اس سے زیادہ کیا عرض کریں کہ ایسا کہنے والے نہ صرف یہ کہ اسلام کی بنیادی تعلیم سے ناواقف ہیں، بلکہ انہوں نے صحابہ کبارؓ پر ایسا سنگین الزام لگایا اور ایسا روح فرسا بہتان تراشا ہے جس سے ہمارے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی ہے۔ پھر اس کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ ہمارے ہاں (بدقسمتی سے) اقامتِ دین کے مدعیوں نے یہ طرح ڈال دی ہے کہ جہاں کسی نے ان کی کسی مذموم حرکت پر مؤاخذہ کیا، انہوں نے جھٹ سے کہہ دیا کہ یہ اسلام کے عین مطابق ہے۔

ہم اس موضوع پر گزشتہ تیس سال سے لکھتے چلے آ رہے ہیں اور اس کی بیّن مثالیں بھی دیتے رہے ہیں۔ ان کے دہرانے کی یہاں ضرورت نہیں۔ یہ قارئین طلوعِ اسلام کے ذہن میں ہوگا۔ سر دست بات سیاسی پارٹیوں کی .... ہو رہی ہے۔ جب ان کے وجود کو غیر اسلامی کہا گیا تو جواب میں کہہ دیا کہ سیاسی پارٹیاں خود صحابہؓ میں موجود تھیں۔ انصار اور مہاجرین دو سیاسی پارٹیاں ہی تو تھیں! ایسے ہی تھے وہ حضرات جن کے متعلق اقبالؒ نے انتہائی سوز و گداز کے عالم میں کہا تھا کہ ؎

چو گویم مسلمانم بلرزم   کہ دانم مشکلاتِ لا الٰہ را

اور ہماری بدقسمتی ملاحظہ فرمائیے کہ ہمیں اس قسم کے اعتراضات کا بھی جواب دینا پڑتا ہے!

کسے معلوم تھا عشق اس طرح لاچار کرتا ہے!

(o)

نوعِ انسان مختلف وجوہات و علل کی بنا پر، مختلف گروہوں میں بٹتی چلی آ رہی تھی۔ قرآنِ کریم نے ان تمام وجوہ تفرق و اسبابِ تقسیم کو بالاستحقاق رد کر کے، تمام انسانوں کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیا:-

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ فَمِنكُمْ كَافِرٌ وَمِنكُم مُّؤْمِنٌ ..... (64/2)

اللہ نے تم تمام انسانوں کو پیدا کیا۔ پھر تم میں سے کچھ کافر ہو گئے، کچھ مومن۔

وہ کون سی صداقت تھی جس کے ماننے والے (مومن) ایک گروہ قرار پا گئے۔ اور اسے نہ ماننے والے (کافر) دوسرا گروہ؟ یہ ضابطۂ خداوندی تھا جسے اس کی الکتاب یا قرآن مجید کہا جاتا ہے۔ بالفاظِ دیگر، قرآنِ کریم کو اپنی زندگی کا ضابطہ ماننے والے، ایک گروہ۔ ایک جماعت۔ ایک اُمت۔ ایک "پارٹی"۔ اور ایسا نہ ماننے والے، ان کے بالمقابل، دوسرا گروہ۔ دوسری اُمت۔ دوسری پارٹی۔ انہی دو گروہوں کو اس نے حزب اللہ ـــــ اللہ کی پارٹی (58/22) اور حزب الشیطان ـــــ شیطان کی پارٹی (58/19) کہہ کر پکارا ہے۔ لہٰذا، اسلام کی رو سے دنیا میں پارٹیاں دو ہی ہیں ـــــ حزب اللہ اور حزب الشیطان۔

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، حزب اللہ کی وجۂ جامعیت، ضابطۂ خداوندی (قرآنِ مجید) کے ساتھ تمسک اور اعتصام تھا۔ یعنی دنیا کے مختلف افراد، جنہوں نے کتاب اللہ کو ضابطۂ حیات تسلیم کر لیا، حزب اللہ کے ارکان بن گئے۔ اس لئے ان سے تاکیداً کہا کہ

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ..... (۳/۱۰۳)

(اے افرادِ حزب اللہ) تم سب کے سب، اللہ کی کتاب کے ساتھ وابستہ رہو اور
آپس میں تفرقہ مت پیدا کرو۔

یعنی ارکانِ حزب اللہ (افرادِ جماعتِ مومنین۔ امّتِ مسلمہ) میں سے جس نے ضابطۂ خداوندی کے سوا کسی اور ضابطہ کے ساتھ تمسّک (پیوستگی) کر لی وہ اس حزب کا رکن اور اس جماعت کا فرد نہ رہا۔ تفرقہ کے معنی ہی اصل سے الگ ہو جانا ہے۔ اس لئے " اعتصام بحبل اللہ " کے ساتھ، تفرقہ سے اجتناب کی بھی تاکید کر دی، کیونکہ یہ دونوں یکجا نہیں رہ سکتے۔ اعتصام بحبل اللہ ہوگا تو اس کا نتیجہ امّتِ واحدہ ہوگی۔ اعتصام بحبل اللہ نہ رہے گا تو وحدت ٹوٹ جائے گی اور تفرقہ پیدا ہو جائے گا۔ اسی لئے قرآنِ کریم نے اعتصام بحبل اللہ کو توحید اور تفرقہ کو شرک قرار دیا ہے۔ فرمایا:۔

..... وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ۝ (۳۰/۳۱-۳۲)

اے جماعتِ مومنین! دیکھنا کہیں تم (توحید کے قائل ہونے کے بعد) مشرکین میں سے نہ ہو جانا۔ یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں تفرقہ پیدا کر لیا اور اس طرح ایک الگ پارٹی بنا لی۔ اس پارٹی بازی میں کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ ہر گروہ اپنے آپ کو حق پر (اور دوسری پارٹیوں کو باطل پر) سمجھتا ہے۔

رسول اللہ، حزب اللہ (امّتِ مسلمہ) کی مملکت کے سربراہ تھے۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ اس حزب سے الگ کوئی پارٹی بنا لیں، ان کے سربراہ HEAD رسول اللہ نہیں رہیں گے۔ اس لئے فرمایا کہ

اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ (۶/۱۶۰)

اے رسول! جو لوگ اپنے دین میں تفرقہ پیدا کر کے الگ پارٹی بنا لیں تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں رہے گا۔

ان آیات میں دین میں تفرقہ پیدا کر کے ایک الگ پارٹی (شیعًا یا حزب) بن جانے کو شرک اور رسول اللہ سے لاتعلقی (کفر) قرار دیا گیا ہے۔ اسلام میں (یعنی قرآن کی رُو سے) مذہب اور سیاست الگ الگ نہیں۔ دین ان دونوں کے امتزاج کا نام ہے۔ مذہب اور سیاست کا الگ الگ تصوّر اور الگ الگ اصطلاحات؛ سیکولرازم کی پیدا کردہ ہیں۔ لہٰذا، جب قرآنِ کریم نے دین میں تفرقہ کو شرک اور انکارِ رسالت قرار دیا تو اس میں مذہبی فرقہ بندی اور سیاسی تحزّب (پارٹی بازی) دونوں آ گئے۔ ذرا غور کیجئے کہ مذہبی فرقے اور سیاسی پارٹیاں وجود میں کس طرح آتی ہیں؟ مذہبی فرقے عقائد میں اختلاف سے پیدا ہوتے ہیں، اور سیاسی پارٹیوں کا منشور الگ الگ ہوتا ہے۔ اگر صرف خدا کی کتاب کے ساتھ تمسک ہو تو نہ عقائد مختلف ہو سکتے ہیں، نہ منشور الگ الگ۔ اور جب عقائد اور منشور الگ الگ نہیں ہوں گے تو نہ مذہبی فرقے باقی رہیں گے، نہ سیاسی پارٹیاں۔ ایک ضابطۂ حیات اور اس کی ماننے والی ایک امّت باقی رہے گی۔ یہی اسلام کی بنیادی شکل ہے۔

امت کی یہی وحدت تھی جس سے وہ دین و دنیا کی سرفرازیوں اور کامرانیوں کی مستحق قرار پائی تھی۔ اس کے برعکس، اختلاف کو اللہ تعالیٰ نے عذاب قرار دیا تھا اور اس سے جماعتِ مومنین کو بڑی سختی سے روکا تھا جب فرمایا تھا کہ

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ ۚ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝ (۳/۱۰۴)

اے جماعتِ مومنین! تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے (خدا کی طرف سے) واضح ہدایات آجانے کے بعد، تفرقہ اور اختلاف پیدا کر لیا اور اس طرح عذابِ عظیم کے مستوجب ہو گئے۔

اس عذاب کو قرآن نے "منہ کالا ہو جانے" سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی دنیا اور آخرت کی روسیاہی (۳/۱۰۵)

یہ تو دین اور امتِ مسلمہ کا معاملہ ہے۔ کسی (عام) قوم کو پارٹیوں میں تقسیم کر دینا بھی بارگاہِ انسانیت میں ایسا سنگین جرم ہے جس کی قرآن کریم نے شدید مذمت کی ہے۔ اس نے سیاستِ فرعونی کے خلاف جو فردِ جرم عائد کی تھی اس میں سرِ فہرست یہ لکھا تھا کہ

إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ وَجَعَلَ أَهْلَهَا شِيَعًا يَسْتَضْعِفُ طَائِفَةً مِّنْهُمْ .... إِنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ ۝ (۲۸/۴)

حقیقت یہ ہے کہ فرعون انتہائی سرکشی پر اتر آیا تھا۔ وہ ملک کے باشندوں (قوم) کو پارٹیوں میں تقسیم کرتا رہتا تھا اور پھر اپنی ابلیسی سیاست کی رو سے کبھی ایک پارٹی کو کمزور کر دیتا کبھی دوسری کو ...... یوں وہ فسادِ عظیم برپا کرتا رہتا تھا۔

آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کی رو سے، قوم میں پارٹیاں بنانا 'سیاستِ فرعونی' ہے۔ سو جب وہ اسے فرعون کی قوم میں بھی جائز نہیں سمجھتا تو اس کا تصور بھی کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے نظام (اسلام) میں اسے جائز قرار دے گا؟ وہ اسے خدا کا عذاب قرار دیتا ہے۔ وہ، سورۃ الانعام میں، عذابِ خداوندی (قوموں کی تباہی) کی مختلف شکلوں کے سلسلہ میں ایک شکل یہ بتاتا ہے۔ أَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَيُذِيقَ بَعْضَكُم بَأْسَ بَعْضٍ .... (۶/۶۵) کہ قوم مختلف پارٹیوں میں بٹ جائے اور اس طرح باہمی تصادم سے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے۔

یہ ہے قرآن کریم کی رو سے، عام قوموں میں بھی ...... پارٹی بازی کا نتیجہ۔ یہ خدا کا عذاب ہے۔

———— (۰) ————

ان تصریحات کی روشنی میں کیا اس کا تصور بھی کیا جا سکتا ہے کہ صحابہ کبارؓ مختلف سیاسی پارٹیوں میں بٹے ہوئے تھے؟ ان کے ایمان و تقویٰ کے علاوہ، قرآن کریم نے ان کی بنیادی صفات یہ بتائی ہیں کہ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ (۴۸/۲۹) ان کے باہمی تعلقات نہایت محبت اور مودت کے تھے۔ اسلام لانے سے پہلے، وہ باہمی عداوت سے گویا جہنم کے کنارے تک پہنچ چکے تھے۔ فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُم بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا .... (۳/۱۰۲) اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو آپس میں جوڑ دیا اور اپنی نعمتِ خصوصی کی رو سے انہیں

آپس میں بھائی بھائی بنا دیا۔ وہ ایک جماعت تھی۔ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ۔ سیسہ پلائی ہوئی دیوار (۶۱/۴) تھی۔ ہم پوچھتے ہیں ان بزرجمہروں سے جو فرماتے ہیں کہ صحابہ رضؓ سیاسی پارٹیوں میں بٹے ہوئے تھے، کہ کیا سیاسی پارٹیوں کے افراد کے باہمی تعلقات اسی قسم کے ہوتے ہیں؟ وہ تو ایک دوسرے کے جانی دشمن اور ہر وقت دوسری پارٹی کی تخریب اور تذلیل کی فکر میں رہتے ہیں۔

اب آیئے مہاجرین اور انصار کی طرف! سب سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ ان کی صورت یہ نہیں تھی کہ جماعت مومنین میں سے کچھ لوگوں نے اپنا الگ منشور مرتب کر کے، اپنی جداگانہ پارٹی بنا لی تھی جسے وہ مہاجرین کے نام سے منسوب کرتے تھے۔ اور ان کے مقابل، دوسری پارٹی نے اپنا الگ منشور اختیار کر کے دوسری پارٹی قائم کر لی تھی جو انصار کے نام سے موسوم تھی۔ بات یہ نہیں تھی۔ ہجرت اور انصاریت ان کی خصوصی صفات تھیں جن سے متصف ہونے کی بنا پر انہیں مہاجرین اور انصار کہہ کر پکارا گیا تھا۔ بعض افراد وہ تھے جو مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آئے تھے۔ اور دوسرے وہ جو مدینہ کے رہنے والے تھے اور انہوں نے ان آنے والوں کا دل کی کشادگی سے استقبال کیا اور ان کی ہر طرح سے امداد کی۔ قرآن کریم نے ان کی ان خصوصی اور متمیز صفات کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ط ..... (۸/۷۲)

وہ لوگ جنہوں نے اپنی جان اور مال سے خدا کی راہ میں جہاد کیا اور ہجرت کی۔ اور وہ جنہوں نے (ان لٹ پٹ کر آنے والوں کو) پناہ دی اور ہر طرح سے ان کی امداد کی۔

یہ دونوں ایک دوسرے کے دوست اور پشت پناہ تھے۔

اللہ تعالیٰ نے انہیں، "بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ" کہا ہے۔ نبی اکرمؐ نے عملی قدم اٹھایا اور ان میں سلسلۂ مؤاخات قائم کر دیا۔ یعنی مہاجرین میں سے ایک کو انصار میں سے ایک کا بھائی بنا دیا۔ اور اس مؤاخات میں انہوں نے، من تو شدم تو من شدی، کا ایسا محیر العقول ثبوت دیا جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ ان تعلقاتِ اخوت میں وہ اس حد تک آگے بڑھ گئے کہ تقسیمِ وراثت تک میں انہیں حصہ دار سمجھنے لگ گئے۔ تا آنکہ اللہ تعالیٰ کو انہیں اس سے روکنا پڑا۔ کیونکہ اس سے رحمی رشتہ داروں کے مفاد متاثر ہوتے تھے۔ (۸/۷۵) قرآن کریم نے ان دونوں کو "مومنِ حقاً" (سچے اور پکے مومن) کی سند سے نوازا۔ (۸/۷۴) اور رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ (۹/۱۰۰) کی شہادتوں سے سرفراز فرمایا اور انہیں جنت کا مستحق قرار دیا ہے۔ ان کا یہ تعارفی تشخص (مہاجرین اور انصار) ابتدائے ہجرت سے وجود میں آ گیا تھا اور حضور نبی اکرمؐ کی پوری مدنی زندگی میں یہ اسی طرح قائم رہا۔ کیا اس دوران میں کہیں آپ کو ان کے دو جداگانہ سیاسی پارٹیوں کے افراد ہونے کی خفیف سی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے؟

معترضین کا کہنا یہ ہے کہ رسول اللہؐ کی زندگی میں تو ایسا نہیں ہوا تھا لیکن رسول اللہؐ کی وفات کے فوراً بعد انہوں نے یکایک دو متخاصم سیاسی پارٹیوں کی شکل اختیار کر لی تھی اور حصولِ اقتدار کی خاطر، امت کا پہلا

انتخاب لڑا تھا! یعنی (بقول ان کے) رسول اللہؐ کی وفات کے فوری بعد، ان میں ایسا انقلاب آیا کہ انہوں نے "رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ" ــــ "بَعْضُهُمْ أَوْلِيَآءُ بَعْضٍ" ــــ "أَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ ــــ فَأَصْبَحْتُم بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا" کی خدائی سندات اور رسول اللہؐ کی قائم کردہ مؤاخات کا لبادہ یک دم اتار پھینکا اور دو حریف گروہوں کی شکل میں انتخاب لڑنے کے لئے ایک دوسرے کے بالمقابل کھڑے ہو گئے! (معاذ اللہ)۔ ظاہر ہے کہ ان میں ایسی تبدیلی راتوں رات تو نہیں آ سکتی تھی۔ (بلکہ اس میں تو ایک رات بھی نہیں گذری تھی۔ انتخاب کا واقعہ تو حضورؐ کی وفات کے ساتھ ہی کا ہے) اس اعتراض سے تو ایسا مترشح ہوتا ہے کہ یا وہ عمر بھر انہی خطوط پر دل میں سوچتے رہے ہوں گے اور جونہی موقعہ ملا وہ بے نقاب ہو کر سامنے آ گئے۔ (استغفر اللہ!)۔

سوال یہ ہے کہ اس بات کی سند کیا ہے کہ مہاجرین اور انصار، اس "انتخابی مہم" میں متخالف سیاسی پارٹیوں کی طرح ایک دوسرے کے مدِ مقابل تھے؟ اس کی سند ہے ہماری تاریخ۔ اس تاریخ میں اتنا ہی نہیں کہا گیا کہ انہوں نے آئینی انداز سے یہ انتخاب لڑا تھا۔ تاریخ اس سے آگے بھی بڑھتی ہے اور فریقین کے باہمی جدال کی ایسی تفصیلات پیش کرتی ہے جنہیں سینے پر پتھر رکھ کر بھی درج نہیں کیا جا سکتا۔ ہماری تاریخ کے اُردو تراجم بھی عام طور پر ملتے ہیں۔ جس کا جی چاہے انہیں دیکھ سکتا ہے۔ پرویز صاحب کی کتاب "شاہکارِ رسالت" میں بھی بہت سی تاریخی تفصیلات دی گئی ہیں۔

تاریخ کے علاوہ، ہماری کتبِ روایات میں بھی صحابہؓ کے متعلق بہت کچھ ملتا ہے۔ مثلاً بخاری شریف کی اس روایت کو سامنے لایئے جس میں کہا گیا ہے کہ

> حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ قیامت کے دن میرے چند صحابہؓ کو جہنم کی طرف لئے جا رہے ہوں گے۔ میں کہوں گا، یہ تو میرے صحابہؓ ہیں۔ اس پر اللہ فرمائے گا کہ جب آپ ان سے الگ ہوئے تو یہ لوگ (مُرتدين على أعقابهم) اسلام چھوڑ کر اپنے پچھلے دین کی طرف لوٹ گئے تھے۔
>
> (بخاری۔ کتاب الانبیاء۔ ترجمہ شائع کردہ نور محمد تاجر کتب۔ کراچی۔ جلد دوم۔ صفحہ ۱۴۹)

یہاں تو پھر بھی "چند صحابہؓ" کا ذکر ہے۔ ہماری تاریخ جملہ صحابہ کبارؓ کو جس مقام پر پہنچاتی ہے اس کے تصور سے (عام الفاظ میں) "عرشِ الٰہی تک ہل جاتا ہے"۔ قرآنِ مجید میں ہے کہ

> وَمَن يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا وَغَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهُ وَأَعَدَّ لَهُ عَذَابًا عَظِيمًا ٥ (۴/۹۳)۔
>
> جو شخص کسی مومن کو بالارادہ قتل کر دے تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ رہے گا۔ اس پر خدا

---

۱ اشارہ (۳/۱۴۴) کی طرف ہے۔

کا غضب اور اس کی لعنت ہوگی۔ خدا نے اس کے لئے شدید عذاب تیار کر رکھا ہے۔

آپ نے دیکھا کہ قرآن کریم کی رو سے ایک مومن کے قتلِ عمد کی پاداش اور عقوبت کیا ہے؛ لیکن تاریخ میں بتاتی ہے کہ حضرت عثمان رضؓ کی شہادت کے بعد جنگِ جمل ہوئی تو اس میں (بجز معدودے چند) آدھے صحابہ رضؓ ایک طرف تھے اور آدھے دوسری طرف۔ ان میں باہمی جنگ ہوئی جس میں دس ہزار صحابہؓ ایک دوسرے کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ اور ظاہر ہے کہ جنگ میں قتل بالارادہ ہوتا ہے۔ اس میں ہر ایک کی کوشش ہوتی ہے کہ دوسرے کو قتل کر دے —— دس ہزار صحابہ رضؓ کا قتلِ عمد خود ایک دوسرے کے ہاتھوں سے —— اور اس کے بعد جنگِ صفین میں (تاریخ کے بیان کے مطابق) ستر ہزار صحابہؓ ایک دوسرے کے ہاتھوں قتل ہوئے! آپ سوچیئے کہ اگر اس تاریخ کو مستند مان لیا جائے تو پھر قرآن کریم کے مذکورہ صدر فیصلہ کی رو سے (رسول اللہؐ کے) ان تمام صحابہ رضؓ کے متعلق کیا نتیجہ اخذ کیا جائے گا؟

یہ ہے ہماری وہ تاریخ جس کی بنا پر، یہ کہا جاتا ہے کہ مہاجرین اور انصار دو مستقل سیاسی پارٹیاں تھیں۔ اور پھر صحابہؓ کی اس (مزعومہ) روش کو سند قرار دے کر یہ اصول مستنبط کیا جاتا ہے کہ اسلام میں سیاسی پارٹیاں قائم کرنے کی اجازت ہے!

حقیقت یہ ہے کہ امت ہزار سال سے جس خلفشار، انتشاد، اختلاف اور افتراق کے عذاب میں مبتلا چلی آرہی ہے، اس کا بنیادی سبب ہماری تاریخ ہے (جس میں روایات بھی شامل ہیں) آپ کو معلوم ہے کہ یہ تاریخ مرتب کب اور کس طرح ہوئی تھی؟ ہمارے ہاں سب سے پہلی مفصل تاریخ (جسے نہایت مستند قرار دیا جاتا ہے) امام طبریؒ کی تاریخ ہے۔ (سب سے پہلی تاریخ بھی ان کی ہے اور سب سے پہلی تفسیر بھی انہی کی) یہ طبرستان کے رہنے والے تھے۔ ۲۲۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۳۱۱ھ میں وفات پائی۔ انہوں نے تیرہ جلدوں میں صدر اول کی تاریخ، بغیر کسی سابقہ ریکارڈ کے، زبانی روایات کی بنا پر مرتب کی۔ اس کے علاوہ، انہوں نے تیس جلدوں میں قرآن مجید کی تفسیر بھی لکھی۔ ان کی یہی تاریخ بعد میں مرتب ہونے والی تاریخوں کا ماخذ، اور ان کی تفسیر تمام تفاسیر کا سرچشمہ قرار پائی۔

مروجہ اسلام، اسی قسم کی تاریخ، تفسیر اور روایات پر مبنی ہے۔ (احادیث کے مجموعے بھی اسی طرح زبانی روایات کی بنا پر، تیسری صدی ہجری میں مرتب ہوئے تھے۔ ان کے جامعین بھی سب ایرانی تھے۔ (ہم نے یہاں مختصر اشارات پر اکتفا کیا ہے۔ جو حضرات تفصیلی معلومات حاصل کرنا چاہیں، وہ ادارہ کی طرف سے شائع کردہ کتاب سلیم کے نام خطوط (جلد سوم)، مقامِ حدیث اور شاہکارِ رسالت کا مطالعہ فرمالیں)۔

مہاجرین اور انصار کے دو سیاسی پارٹیاں ہونے کے دعویٰ کے سلسلہ میں ایک اور نکتہ بھی قابلِ غور ہے۔ خلافتِ راشدہ کے پورے دور میں، مملکتِ اسلامیہ کے اعیان و ارکان یہی حضرات تھے۔ کیا آپ کو خلفائے راشدینؓ کی مجالس مشاورت (پارلیمان) میں کہیں یہ دکھائی دیتا ہے کہ ایک طرف (حزبِ اقتدار کی حیثیت سے) مہاجرینؓ بیٹھے ہوں اور ان کے مقابل (حزبِ مخالف کی حیثیت سے) انصارؓ اور دونوں میں وہ کچھ ہوتا ہو جو سیاسی

پارٹیوں میں ہوا کرتا ہے؛ پاریاں کے علاوہ، کیا اس سارے دور میں، ان کے دو متخالف سیاسی پارٹیاں ہونے کی کوئی خفیف سی ...... جھلک بھی دکھائی دیتی ...... ہے؛ تو کیا ان کا یہ تحزّب (پارٹیوں میں بٹ جانا) انتخاب سقیفہ بنی ساعدہ تک محدود رہا! اس کے بعد انہوں نے اپنی اپنی پارٹیوں کو کالعدم قرار دے دیا؟ اس کے برعکس، ایک عجیب حقیقت سامنے آتی ہے۔ صدرِ اوّل میں (بلکہ اس کے بعد بھی) امورِ مملکت میں نمایاں حیثیت مہاجرینؓ کی نظر آتی ہے لیکن اُمت میں تعارفی تشخص انصار کا چلا آ رہا ہے۔ "اے۔ ڈی۔ انصاری" اور "ایم۔ زیڈ۔ انصاری" تو آپ کو قدم قدم پر ملیں گے لیکن کہیں "مہاجر" کہیں دکھائی نہیں دے گا۔[1] اس سے مترشح ہوتا ہے کہ انصارؓ نے جو بے لوث خدمات سرانجام دی تھیں، اُمت کی نگاہ میں وہ اس قدر محبوب تھیں کہ ان کی طرف تعارفی نسبت زندہ جاوید ہو گئی۔ کیا آپ آج کے انصاریوں کو بھی ایک الگ سیاسی پارٹی کے افراد قرار دیں گے؟

حقیقت یہ ہے کہ اس زمانے میں مختلف سیاسی پارٹیوں (بالخصوص حزبِ اقتدار اور حزبِ مخالف) کا تصوّر تک بھی دنیا کے سامنے نہیں آیا تھا۔ عربوں کے ہاں تو ایک طرف (جہاں بطور ایک نظام اور ادارہ کے خود حکومت کا تصوّر بھی، اسلام سے پہلے، موجود نہیں تھا) اس زمانے کی متمدن ترین مملکتیں (رومی اور ایرانی) بھی اس سے ناآشنا تھیں۔ خود یہ ایک حقیقت بھی اس دعوے کو باطل قرار دے دیتی ہے کہ انصار اور مہاجرین دو سیاسی پارٹیاں تھیں جو اقتدارِ حکومت حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے سے برسرِ پیکار تھیں! اس قسم کے دعاوی، سب افسانے ہیں۔

(۔)

ہم نے جو کچھ تاریخ کے متعلق کہا ہے (اور اسے پہلی بار نہیں کہا۔ ہم اسے مسلسل دہراتے چلے آ رہے ہیں) اس پر کہا یہ جاتا ہے کہ کیا ہم تاریخ اور روایات کے اس سارے مواد کو دریا بُرد کر دیں؟

کون کہتا ہے کہ انہیں دریا بُرد کر دو! دریا بُرد نہیں۔ ان کی تطہیر کرو۔ (مثلاً) قرآن کریم نے صحابہ کبارؓ (مہاجرین اور انصار) کی جو صفات و خصوصیات بیان فرمائی ہیں، وہ یقینی ہیں اور ان کی صداقت پر ہمارا ایمان ہے۔ اب اگر تاریخ یا روایات میں کوئی ایسی بات ملتی ہے جو ان خصوصیات اور امتیازات کے خلاف ہے تو ہم کہہ دیں گے کہ تاریخ کا یہ بیان صحیح نہیں۔ اس سے کوئی قیامت نہیں ٹوٹ پڑے گی۔ لیکن اگر ہم تاریخ یا روایات کے اس قسم کے بیان کو سچا تسلیم کر لیں تو قرآن کریم کی شہادات (معاذ اللہ) جھوٹی قرار پا جائیں گی۔ انہیں جھوٹا سمجھنے سے تو سارا ایمان ہی باقی نہیں رہے گا!

لیکن ہمارے ہاں سند اور حجّت تاریخ اور روایات کو قرار دیا جاتا ہے۔ اس کی کوئی پرواہ نہیں کی جاتی کہ قرآن کی شہادت اس کی تائید کرتی ہے یا اس کے خلاف جاتی ہے! نتیجہ اس کا ظاہر ہے۔

ہم یہ کہتے چلے آ رہے ہیں کہ اُمت کو چاہیئے کہ قرآن کریم کو یقینی اور آخری سند قرار دے کر تاریخ اور روایات کے لٹریچر کو اس کی روشنی میں پرکھ لیا جائے۔ ان میں جو کچھ قرآن کے مطابق ہو اُسے صحیح تسلیم کر لیا

---

[1] ایک آدھ نام کے ساتھ "مہاجر" بھی دیکھنے میں آیا ہے لیکن اس کی نسبت مہاجرین مکہ کے ساتھ معلوم نہیں ہوتی۔

جائے۔ جو اس کے خلاف ہو اسے مسترد کر دیا جائے۔

ہمارا خیال ہے کہ اس باب میں آپ بھی ہم سے متفق ہوں گے حتّیٰ کہ اگر آپ اسے ہمارے قدامت پسند طبقہ کے سامنے پیش کریں گے تو (نظری طور پر) وہ بھی اس کی معقولیت کے قائل ہوں گے۔ لیکن (اس کے باوجود) عملاً اس کے لئے کوئی تیار نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ تاریخ و روایات کے مرتبین اور جامعین کا تقدّس ان کا جزوِ ایمان بن چکا ہے اور وہ اس کی ہمّت ہی نہیں کر سکتے کہ جو کچھ ان حضرات کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، اس پر خفیف سی تنقیدی نگاہ بھی ڈالی جائے۔ جب تک یہ ذہنیت باقی رہے گی نہ ہمارے اختلافات رفع ہوں گے اور نہ ہی اسلام اپنی حقیقی شکل میں ہمارے سامنے آسکے گا۔ اختلافات اس لئے ختم نہیں ہو سکیں گے کہ اس لٹریچر میں باہمدگر متضاد باتیں موجود ہیں۔ کوئی فرقہ کسی روایت کے ساتھ متمسک ہے، کوئی کسی اور کے ساتھ——اور ان میں سے کوئی بھی اپنے مسلک میں ذرا سی تبدیلی کے لئے تیار نہیں——اور حقیقی اسلام اس لئے سامنے نہیں آسکے گا کہ اس لٹریچر میں بہت کچھ ایسا ہے جو حقیقی اسلام کے خلاف ہے۔

سوال یہ ہے کہ تاریخ کی ایسی غیر مستند حیثیت کے باوجود ہمارے ہاں اسے اس قدر اہمیت کیوں دی جاتی ہے؟ اس اہم سوال کا جواب بادنیٰ تعمق سمجھ میں آجائے گا۔ یہ حقیقت قارئین طلوعِ اسلام کے سامنے صد بار آچکی ہے کہ

(۱) قرآنِ کریم میں (بجز چند احکام) دین کے اصول اور اقدار دیئے گئے ہیں۔ ان کی جزئیات اس نے خود متعین نہیں کیں۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے ان جزئیات کو دانستہ غیر متعین چھوڑا ہے۔ منشاءِ خداوندی یہ تھا کہ دین کے اصول و اقدار تو ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں، لیکن ان کی جزئیات، اسلامی مملکت اپنے اپنے زمانے اور حالات کے مطابق خود وضع کرے۔ یہ جزئیات حالات کی تبدیلی کے مطابق بدلتی رہیں گی۔

ہمارا قدامت پرست طبقہ، اس منشاء و مصلحتِ خداوندی کو تسلیم نہیں کرتا۔ وہ کہتا ہے کہ اسلام نام ہی ان جزئیات کا ہے جو ابدی اور غیر متبدل ہیں۔ یہ جزئیات عہدِ رسالتمآبؐ اور دورِ خلافتِ راشدہ میں متعین ہو چکی تھیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ان جزئیات کا کوئی مجموعہ نہ حضور رسالتمآبؐ نے اُمّت کو دیا، نہ ہی خلفائے راشدینؓ نے۔ اس لئے کہ وہ جانتے تھے اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی حکمتِ بالغہ کی رو سے، غیر متعین چھوڑا ہے ان کے سامنے یہ ارشادِ خداوندی تھا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَسْأَلُوا عَنْ أَشْيَاءَ إِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ وَإِنْ تَسْأَلُوا عَنْهَا حِينَ يُنَزَّلُ الْقُرْآنُ تُبْدَ لَكُمْ عَفَا اللَّهُ عَنْهَا وَاللَّهُ غَفُورٌ حَلِيمٌ ۝ قَدْ سَأَلَهَا قَوْمٌ مِنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ أَصْبَحُوا بِهَا كَافِرِينَ ۝ (۵/۱۰۱-۱۰۲)

اے جماعتِ مومنین! جن امور کی تصریحات ہم نے خود نہیں کیں انہیں کرید کرید کر مت پوچھا کرو۔ اس وقت جبکہ وحی کا سلسلہ جاری ہے اگر (بفرضِ محال تمہارے مطالبہ پر) انہیں بھی قرآن میں دیدیا جائے تو تم مشکل میں پڑ جاؤ۔ قرآن میں دے دینے کا مطلب یہ ہوگا کہ ان میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکے

گی اور جب تغیرِ حالات کی بنا پر وہ ناقابلِ عمل ہو جائیں گی تو تمہارے لئے ان کا نباہنا مشکل ہو جائے گا۔ تم سے پہلے بھی ایک قوم نے ایسا ہی کیا تھا۔ پھر ان کی کیفیت یہ ہو گئی کہ انہوں نے ان ناقابلِ عمل جزئیات سے پیچھا چھڑانے کے لئے خود دین کے لبادے ہی کو اتار پھینکا۔ لہذا جن جزئیات کا تعین ہم نے خود نہیں کیا، تم سمجھ لو کہ انہیں دانستہ ایسا رکھا گیا ہے۔

اس کی وضاحت میں نبی اکرمؐ کی ایک حدیث بھی موجود ہے۔ یعنی:۔

ان اللہ فرض فرائض فلا تضیعوھا وحرم حرمات فلا تنتھکوھا وحد حدودا فلا تعتدوھا وسکت عن اشیاء من غیر نسیان فلا تبحثوا عنھا (مشکوٰۃ۔ اعتصام بکتاب وسنت)

اللہ تعالیٰ نے تم پر کچھ باتیں فرض قرار دی ہیں۔ انہیں ضائع نہ کرو۔ چند چیزیں حرام قرار دی ہیں تم ان کے قریب تک بھی نہ پھٹکو۔ اس نے چند حدود مقرر کی ہیں ان سے تجاوز نہ کرو۔ اور باقی چیزوں کے بیان کرنے میں خاموشی اختیار کی ہے۔ تم ان کے متعلق کرید مت کرو، کیونکہ خدا نے ایسا بھول کر نہیں کیا دانستہ کیا ہے۔

یہ تھا قیامت تک رہنے والے دین کا وہ نقشہ جسے اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمایا تھا۔ لیکن ہمارے قدامت پرست حضرات کا عقیدہ ہے کہ خدا کو یہ جزئیات مرتب کرکے دینی چاہئیں تھیں، لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ یہ جزئیات عہدِ رسالتمآبؐ اور دورِ خلافتِ راشدہ میں متعین ہوئیں اور ان کا قیامت تک غیر متبدل رکھا جانا مقصود و مطلوب تھا۔ اس مقصد کے لئے پہلے روایات کے مجموعے اور کتب تاریخ مرتب ہوئیں اور پھر ان میں کرید شروع ہوئی۔ اس کرید سے کسی کو کچھ ملا، کسی کو کچھ (اس لئے کہ ان کتابوں میں تضادات تھے) جس کو جو کچھ ملا، اس نے اسے غیر متبدل دین قرار دے لیا۔ اس طرح مختلف فرقے وجود میں آگئے، جن میں سے ہر ایک کا اسلام، الگ الگ ہے۔ فقہ کی کتابیں مرتب ہو جانے کے بعد، مزید کرید ختم ہو گئی، کیونکہ ان میں مندرج جزئیات کو غیر متبدل سمجھ لیا گیا۔ یہ کرید امورِ دینیہ تک محدود تھی، امورِ مملکت ان کے دائرے سے باہر تھے کیونکہ ملوکیت، آزاد رہنا چاہتی تھی یا ان میں سے اپنی مصلحت کے مطابق کچھ اختیار کرنا۔

لیکن پاکستان میں صورتِ حالات نے عجیب پلٹا لیا۔ اس مملکت کو اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا (اس سلسلہ کہا یہ گیا کہ) یہاں اسلامی نظام قائم ہوگا اور اسلامی قوانین نافذ۔ اسلامی قوانین کے متعلق حضرات علماء کرام یہ کہہ کر قوم کو بہلاتے رہے کہ یہ ضابطہ کتاب و سنت کے مطابق مرتب ہوگا۔ بیس سال کے بعد انہیں یہ اعلان کرنا پڑا کہ کتاب و سنت کے مطابق پبلک لاز کا کوئی ایسا ضابطہ مرتب نہیں ہو سکتا جس پر تمام فرقے متفق ہو سکیں۔ (مرحوم مودودی صاحب نے یہ کہا تھا اور اس مشکل کا حل یہ بتایا تھا کہ یہاں فقہ حنفی کو بطور پبلک لاز نافذ کر دیا جائے)۔ فقہ حنفی وہ جزئیات ہیں جنہیں خدا نے دانستہ غیر متعین چھوڑ دیا تھا۔ جب ان جزئیات کی قسط اوّل، حدود کے نام سے نافذ ہوئی ہے تو مرحوم مودودی صاحب نے ان کا ان الفاظ میں استقبال کیا تھا:۔

صدرِ مملکت جنرل ضیاء الحق نے عید میلاد النبیؐ کے روز چند اہم اسلامی احکام و قوانین کے نفاذ کا جو اعلان کیا ہے وہ ان بے شمار نغموں اور مدحیہ تقریروں سے زیادہ قیمتی ہے جو رسولِ اکرمؐ کی شان میں کی اور کہی گئی ہیں۔ اس لئے کہ حضورؐ کی محبت کا اصل تقاضا تو آپؐ کے لائے ہوئے دین کو قائم کرنا اور آپؐ کے دیئے ہوئے احکام کو نافذ کرنا ہے جس کی نہایت مبارک اور قابلِ تحسین ابتدا صدرِ پاکستان کے اس اعلان سے ہوئی ہے۔ یہ پاکستان کی بہت بڑی خوش قسمتی ہے کہ اپنے جس مقصدِ وجود سے وہ تیس سال محروم رہا، اب اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے وہ اس کی راہ پر گامزن ہو رہا ہے۔　(ایشیا۔ مورخہ ۱۱ر فروری ۱۹۷۹ء)

ان قوانین کی اہمیت کے متعلق انہوں نے فرمایا:۔

انسانی قوانین کی خلاف ورزی کرنا اور چیز ہے اور خدا اور رسول کے قانون کو توڑنا بالکل ہی دوسری چیز ہے۔ اس سے تو آدمی کا ایمان خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ اور وہ خدا کے غضب کا مستحق بن جاتا ہے۔　(ایضاً)

ان قوانین کی خلاف ورزی کا سوال الگ رہا۔ قانون کی خلاف ورزی مستوجب سزا ہوتی ہے۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ

وفاقی شرعی عدالت نے ان قوانین میں سے رجم کی سزا کو خلافِ اسلام قرار دے دیا ہے۔ اور علماء کرام عدالت کے اس فیصلہ کے خلاف شور مچا رہے ہیں! (معلوم نہیں قانوناً ایسی مخالفت کی اجازت بھی ہے یا نہیں؟)۔

آپ نے غور فرمایا کہ اس تمام صورتِ حال کی ذمہ دار (جس سے اسلام کے متعلق جگ ہنسائی ہو رہی ہے) کیا چیز ہے؟ وہی، تاریخ کو غیر متبدل دین کا درجہ دے دینا؛ وفاقی شرعی عدالت کا فیصلہ ہماری نظروں سے نہیں گذرا اس لئے ہم نہیں کہہ سکتے کہ انہوں نے اسے کس سند اور دلیل کی رُو سے مسترد کیا ہے۔ لیکن اسلامی نظریاتی کونسل جس نے اس قانون کو اسلامی قرار دیا تھا اور علما حضرات جو اس کے اسلامی ہونے پر مصر ہیں، ان کی سند تاریخ ہی ہے۔ قرآن کے تو یہ صریحاً خلاف ہے۔ یہ حضرات خدا کے غضب سے نہیں ڈرتے۔ ایک اقدام قرآن کے خلاف کیا۔ غنیمت تھا کہ شرعی عدالت نے اس کی تصحیح کر دی لیکن یہ حضرات خلافِ قرآن قانون کو بحال کرنے پر مصر ہیں۔ (پناہ بخدا!)

———— (۰) ————

یہاں تک بات مذہب سے متعلق تھی۔ اب آیئے سیاست کی طرف۔ دعویٰ یہ ہے کہ یہاں اسلامی نظام حکومت قائم کیا جائے گا اور یہ معلوم کرنے کے لئے کہ اسلامی نظام کس قسم کا ہوتا ہے، پھر تاریخ کو کریدنا شروع کر دیا گیا ہے۔ اس کرید سے کس کس قسم کی متضاد شکلیں سامنے آتی ہیں۔ اس کے متعلق ہم اس سے پہلے تفصیل سے لکھتے چلے آ رہے ہیں۔ اس مقام پر صرف دو چار مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ اسلامی نظام کے خط و خال کے تعین میں مرحوم مودودی صاحب پیش پیش تھے۔ دیکھئے، ان کی کرید کی رُو سے کس کس قسم

کے متضاد نظریات سامنے آتے تھے۔

(۱) چونکہ ہمارا مرکزی موضوع پارٹی سازی ہے اس لئے ہم پہلی مثال اسی سے متعلق پیش کرتے ہیں۔ مرحوم مودودی صاحب نے جب تک اپنی پارٹی (جماعتِ اسلامی قائم نہیں کی تھی، اسلام میں پارٹیوں کے وجود کے متعلق ان کا ارشاد یہ تھا کہ

یہ قوم تو پہلے ہی ایک جمعیت ہے۔ اس جمعیت کے اندر کوئی الگ جمعیت، الگ نام سے بنانا، اور مسلمان اور مسلمان کے درمیان کسی وردی یا ظاہری علامت یا کسی خاص نام یا کسی خاص مسلک سے فرق و امتیاز پیدا کرنا اور مسلمانوں کو مختلف پارٹیوں میں تقسیم کر کے ان کے اندر جماعتوں اور فرقوں کی عصبیتیں پیدا کرنا دراصل مسلمانوں کو مضبوط کرنا نہیں بلکہ ان کو اور کمزور کرنا ہے۔ یہ تنظیم نہیں، تفرقہ پردازی اور گروہ بندی ہے۔ لوگوں نے آنکھیں بند کر کے جمعیت سازی کے یہ طریقے اہلِ مغرب سے لئے ہیں مگر ان کو معلوم نہیں کہ جو چیزیں دوسروں کے مزاج کو موافق آتی ہیں وہ مسلمانوں کے مزاج کو موافق نہیں آتیں۔　　(پیغامِ حق - فروری ۱۹۳۸ء)

اس کے تین ہی سال بعد انہوں نے اپنی پارٹی بنائی، اور نہ صرف یہ کہ اپنے اس اقدام کو مطابق اسلام قرار دیا بلکہ اس پارٹی کا نام ہی جماعتِ اسلامی رکھا اور اسے اقامتِ دین کی علمبردار قرار دیا۔ جب اپنی الگ پارٹی قائم کر لی تو ملک میں عام پارٹی سازی بھی مطابقِ اسلام قرار پا گئی۔ چنانچہ انہوں نے پاکستان آنے کے بعد کہا کہ

جماعتِ اسلامی کسی بھی ایسی پارٹی کے ساتھ تعاون .... کے لئے تیار ہے جو ملک کی خدمت کرنا چاہتی ہے۔ جماعت کو دوسری پارٹیوں سے کوئی کد نہیں لیکن پہلے ان جماعتوں کا وجود میں آنا ضروری ہے۔　　(نوائے وقت - ۲۸ اگست ۱۹۶۲ء)

(۲) ——— ملک میں پارٹی سازی کے متعلق پارلیمان کے اندر پارٹیاں بنانے کے متعلق ان کا فیصلہ یہ تھا کہ

مجالسِ قانون ساز میں پارٹیاں بنانا از روئے دستور ممنوع ہونا چاہیئے۔

(دستوری تجاویز عـــ۱۴)

اس کے بعد جب جماعتِ اسلامی نے پارلیمان میں شمولیت کا فیصلہ کیا، تو اسلام کا دوسرا فیصلہ سامنے آ گیا۔ چنانچہ :-

جماعتِ اسلامی کی مجلسِ شوریٰ کے اجلاس میں یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں جماعتِ اسلامی سے تعلق رکھنے والے افراد کو ہر اسمبلی میں پارلیمانی پارٹی قائم کرنے کی ہدایت کی جائے۔　　(کوہستان - ۱۰ اگست ۱۹۶۲ء)

وہ پہلا فیصلہ بھی اسلام کے مطابق تھا اور یہ دوسرا فیصلہ بھی اسلام کے مطابق!

(۳) پارٹی بازی کے بعد، انتخابات کی طرف آئیے۔ تشکیلِ پاکستان کے بعد پہلے انتخابات ۵۱-۱۹۵۰ء میں منعقد ہوئے۔ اس وقت جماعتِ اسلامی کی پوزیشن ایسی نہیں تھی کہ اسے انتخابات میں کسی قسم کی کامیابی حاصل ہو سکے۔ اس لئے مرحوم مودودی صاحب نے اعلان فرمایا کہ

> اب ہم کو اس امر میں کوئی شک نہیں رہا کہ ہماری اجتماعی زندگی اور قومی سیاست کو جن چیزوں نے سب سے بڑھ کر گندا کیا ہے ان میں ایک امیدواری اور پارٹی ٹکٹ کا طریقہ ہے۔ اسی بنا پر جماعتِ اسلامی نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس ناپاک طریقِ انتخاب کی جڑ کاٹ دی جائے۔ جماعتِ اسلامی نہ اپنے پارٹی ٹکٹ پر آدمی کھڑے کرے گی، نہ اپنے ارکان کو آزاد امیدوار کی حیثیت سے کھڑا ہونے کی اجازت دے گی۔ نہ کسی ایسے شخص کی تائید کرے گی جو خود امیدوار ہو اور اپنے لئے ووٹ حاصل کرنے کی کوشش کرے، خواہ انفرادی طور پر یا کسی پارٹی ٹکٹ پر۔ یہی نہیں بلکہ جماعت اپنی انتخابی جدوجہد میں خاص طور پر یہ بات عوام الناس کے ذہن نشین کرائے گی کہ امیدوار بن کر اٹھنا اور اپنے حق میں ووٹ مانگنا آدمی کے غیر صالح اور نا اہل ہونے کی پہلی اور کھلی ہوئی علامت ہے۔ ایسا شخص جب اور جہاں کہیں سامنے آئے لوگوں کو فوراً سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ ایک خطرناک شخص ہے۔ اس کو ووٹ دینا اپنے حق میں کانٹے بونا ہے۔
>
> (جماعتِ اسلامی کی انتخابی جدوجہد)

یہ اُس وقت کے اسلام کا فیصلہ تھا۔ اس کے بعد، جب ۱۹۵۶ء کے دستور کے تابع ہونے والے انتخابات میں، انہیں اپنی جماعت کی کامیابی کے امکانات نظر آنے لگے تو انہوں نے اعلان فرمایا کہ

> جماعتِ اسلامی نے ۵۱-۱۹۵۰ء کے انتخابات کے موقع پر ایک پالیسی کا اعلان کیا تھا اور وہ یہ تھی کہ امیدواری چونکہ اسلام میں ناجائز ہے اس لئے ہم نہ خود امیدوار بن کر کھڑے ہوں گے اور نہ کسی امیدوار کو ووٹ دیں گے۔ بعد میں تجربات سے ہم کو معلوم ہوا کہ ہم ابھی اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ ہر ضمنی اور عام انتخابات میں پورے ملک کی ہر نشست کے لئے اپنے معیارِ مطلوب کے مطابق موزوں امیدوار کھڑے کر سکیں۔ اس لئے ہم نے سابقہ پالیسی میں یہ تغیر کر دیا ہے کہ ہم خود تو امیدوار بن کر کھڑے ہونے سے بدستور مجتنب رہیں گے لیکن فاسد عناصر کے شر کو دفع کرنے اور ان کے مقابلے میں نسبتاً صالح اور اسلامی نظام کے حامی عناصر کو آگے بڑھانے کے لئے جن امیدواروں کی تائید ناگزیر محسوس ہو گی انہیں ووٹ دیں گے بھی اور دلائیں گے بھی۔
>
> (ترجمان القرآن - بابت مئی ۱۹۵۸ء)

سیکولر سیاست میں، پالیسی میں اس قسم کی تبدیلیاں عام ہوتی ہیں۔ انہیں نہ معیوب سمجھا جاتا ہے نہ ناجائز لیکن مرحوم مودودی صاحب اپنی سیاست کو دین کے تابع رکھنے کے مدعی تھے۔ اس بنا پر یہ اعتراض پیدا ہوا کہ انتخابات کے متعلق یہ متضاد فیصلے کس طرح اسلام کے مطابق قرار پائیں گے۔ اس احساس کے ماتحت انہوں نے فرمایا:

> ہر معقول آدمی بیک نظر محسوس کر لے گا کہ ہماری یہ نئی پالیسی ٹھیک ٹھیک دینی نظام کے مطابق ہے اور اس میں دراصل کوئی اصول شکنی نہیں کی گئی۔ (ایضاً)

اس کے بعد جماعتِ اسلامی نے ہر انتخاب میں براہِ راست حصہ لیا۔ انہوں نے انتخاب کے سلسلہ میں اپنی جماعت کا یہ نصب العین بیان کیا تھا کہ

وہ گمراہ اور آزمائے ہوئے غلط کار لوگوں کے مقابلہ میں ان لوگوں کو قوم کے سامنے لانا چاہتی ہے جو دیندار بھی ہوں اور دیانتدار بھی۔ اور اس کے ساتھ حکومت چلانے کی اہلیت بھی رکھتے ہوں۔ (منشور جماعت اسلامی۔ صلا)

ان سے پوچھا گیا کہ اگر کنونشن مسلم لیگ کا کوئی امیدوار جماعتِ اسلامی کے معیار پر پورا اترتا ہو تو کیا جماعت اس کی حمایت کرے گی؟ انہوں نے فرمایا:۔

اگر کنونشن مسلم لیگ کسی فرشتے کو بھی امیدوار کھڑا کرے تو جماعت اس کی حمایت نہیں کریگی کیونکہ ہمیں اس کے اصولوں سے اتفاق نہیں۔ (امروز۔ ۲۰ اگست ۱۹۶۳ء)

اس کے برعکس :۔

اگر ایک ہندو، جمہوری نظام کی حمایت کرتا ہے تو اسے میری تائید حاصل ہوگی کہ اس نے یہ اصول تو تسلیم کر لیا کہ ملک کا نظام اکثریت کی نظریئے کے مطابق ہونا چاہیئے۔ (ایضاً)

"اکثریت کے نظریہ کے مطابق نظام" کو اصطلاحاً جمہوری کہا جاتا ہے۔ غیر منقسم ہندوستان میں مرحوم مودودی صاحب مسلم لیگ کے سخت مخالف تھے۔ جب ان سے کہا جاتا کہ مسلمانوں کی اکثریت، مسلم لیگ کے ساتھ ہے، اور ان کا مطالبہ ہے کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے ان میں ان کی اپنی آزاد حکومت قائم ہونی چاہیئے۔ تو آپ اس کی مخالفت کیوں کرتے ہیں، تو ان کا جواب یہ تھا کہ

جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے، ہندو اکثریت کے تسلط سے آزاد ہو جائیں اور یہاں جمہوری نظام قائم ہو جائے تو اس طرح حکومتِ الٰہی قائم ہو جائے گی ان کا گمان غلط ہے۔ دراصل اس کے نتیجے میں جو کچھ حاصل ہوگا وہ صرف مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی۔

(ترجمان القرآن۔ محرم ۱۳۶۰ھ)

اصولی طور پر، اکثریت کے فیصلوں کے متعلق انہوں نے دو ٹوک الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ

اسلام تعداد کی کثرت کو حق کا معیار تسلیم نہیں کرتا۔ (اسلام کا نظریۂ سیاسی۔ صلا)

یعنی اس وقت "اکثریت کے نظام" کے متعلق اسلام کا فیصلہ یہ تھا۔ اور اس کے بعد ایک ہندو کو اس لئے ترجیح دی جاتی تھی کہ وہ اکثریت کے نظام کے حق میں تھا۔

(۴) ایک اور مثال۔ سوال یہ پیدا ہوا کہ اسلامی نظامِ حکومت میں صدرِ مملکت کے اختیارات کیا ہوں گے؟ مرحوم مودودی صاحب نے فرمایا :۔

جب امیر چن لیا جائے گا تو اس کو سیاہ و سفید کے اختیارات ہوں گے۔ امیر کو مشورہ کے ساتھ کام کرنا ہوگا۔ عموماً مجلس کے فیصلے کثرتِ رائے سے ہوں گے۔ مگر اسلام تعداد کی کثرت کو حق کا معیار تسلیم نہیں کرتا۔ اسلام کے نزدیک یہ ممکن ہے کہ ایک اکیلے شخص کی رائے مجلس کے مقابلہ میں برحق ہو۔ اور اگر ایسا ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ حق کو اس لئے چھوڑ دیا جائے کہ اس کی تائید میں ایک جمِ غفیر نہیں ہے۔ لہٰذا، امیر کو حق ہے کہ اکثریت کے ساتھ اتفاق کرے یا اقلیت کے ساتھ۔

اور امیر کو یہ بھی حق حاصل ہے کہ پوری مجلس سے اختلاف کر کے اپنی رائے پر فیصلہ کرے۔
(اسلام کا نظریۂ سیاسی)

اس سے بھی واضح تر الفاظ میں، انہوں نے ترجمان القرآن کی جون ۱۹۴۸ء کی اشاعت میں لکھا:-

امیر مملکت شوریٰ کی اکثریت کے مقابلہ میں ویٹو کا استعمال کر سکے گا۔

جماعت اسلامی نے پاکستان کے آئین کے سلسلہ میں جو دستوری خاکہ مرتب کیا تھا اس کی دفعہ ۲۶ میں یہ کہا گیا تھا کہ

امیر کو مجلس کی اکثریت کے مقابلہ میں ویٹو کا حق حاصل ہو گا۔

یہ اُس وقت کے اسلام کا فیصلہ تھا۔ (بدقسمتی سے) اس کے بعد صدر ایوب خان (مرحوم) کا دور آگیا، جن کے مرحوم مودودی صاحب سخت مخالف تھے۔ اس وقت سوال یہ اٹھا کہ صدر کے اختیارات کیا ہوں گے؛ ترجمان القرآن کی نومبر ۱۹۶۳ء کی اشاعت میں ایک صاحب کا سوال اور مرحوم مودودی صاحب کا جواب شائع ہوا تھا جس کا عنوان تھا ـــــــ صدر ریاست کو ویٹو کا حق۔

مستفسر نے یہ کہا تھا کہ عام طور پر یہ تجویز کیا جا رہا ہے کہ صدر مملکت کو ویٹو کا حق حاصل ہونا چاہیئے۔ اور اس کی تائید میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ان فیصلوں کا حوالہ دیا جاتا ہے جن میں انہوں نے ویٹو کا حق استعمال کیا تھا۔ مرحوم مودودی صاحب نے جواب میں کہا:... کہ یہ تجویز اسلام کے خلاف ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے جن فیصلوں کا حوالہ دیا جاتا ہے، وہ ویٹو کی رُو سے فیصلے نہیں تھے۔ صدر مملکت کو ویٹو کا حق حاصل نہیں ہو سکتا۔

ہم نے یہ مثالیں، یہ بتانے کے لئے پیش نہیں کیں کہ مرحوم مودودی صاحب مختلف اوقات میں متضاد فیصلے دیا کرتے تھے۔ اس سے ہمارا مقصد یہ بتانا ہے کہ اگر اسلام میں سند، صدرِ اوّل کی تاریخ (جس میں روایات بھی شامل ہیں) کو قرار دے لیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آپ کو اس سے ہر نظریہ کے موافق اور مخالف سندات مل سکتی ہیں۔ مرحوم مودودی صاحب اپنے ہر متضاد فیصلے کی تائید میں کوئی نہ کوئی تاریخی سند پیش فرمایا کرتے تھے۔ جب انہوں نے یہ کہا تھا کہ کتاب و سنت کی رُو سے پبلک لاء کا کوئی ایسا ضابطہ مرتب نہیں ہو سکتا جو سب کے نزدیک متفقہ طور پر اسلامی قرار پا سکے تو ان کے پیش نظر یہی حقیقت تھی۔ اس کا انہیں ذاتی تجربہ تھا کہ کتبِ تاریخ و روایات میں ہر متضاد نظریہ کی تائید میں سندات مل سکتی ہیں۔

(جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں) مذہبی فرقہ بندی کی بنیاد بھی انہی سندات پر ہے۔ اُمت کے لئے یہ تفرقہ انگیزی بھی کچھ کم تباہی کا موجب نہیں لیکن جب یہ انداز سیاست میں اختیار کیا جائے، تو اس سے ایسا انتشار پیدا ہو سکتا ہے جس سے خود مملکت کا وجود خطرہ میں پڑ جائے۔ مذہبی فرقوں کی صورت یہ ہے کہ انہوں نے جو عقائد اور مسالک اختیار کر لئے ہیں، انہیں ابدی اور غیر متبدل قرار دے لیا ہے۔ (مثلاً) اگر اہلحدیث حضرات کے نزدیک نماز میں سینے پر ہاتھ باندھنا شریعت کے مطابق ہے، تو ایسا کبھی نہیں ہو گا کہ وہ کبھی سینے پر ہاتھ باندھنا مطابق شریعت قرار دے لیں، اور کسی وقت زیرِ ناف ہاتھ باندھنا مطابق شریعت تسلیم کر لیں۔ لیکن اگر امور مملکت کو اسی "اسلام" کے تابع رکھا گیا تو نتیجہ یہ ہو گا کہ آج آئین کی ایک شق کو شریعت کے مطابق

تسلیم کیا جائے گا کل کو (دوسری پارٹی) شریعت کا متضاد فیصلہ لے آئے گی جس سے وہ شق کالعدم قرار پا جائیگی۔ ابھی تو دو چار قوانین سامنے آئے ہیں۔ "کتاب و سنّت" کے مطابق، نظامِ مملکت یا اسلامی آئین کا کوئی ڈھانچہ مرتب کیجئے اور پھر دیکھئے کہ "کتاب و سنت" ہی کی رُو سے، اس مسودہ کی کس طرح دھجیاں اُڑتی ہیں۔ واضح رہے کہ "کتاب و سنّت" میں کتاب (قرآن) کا لفظ محض برائے وزنِ بیت شامل کیا جاتا ہے۔ اصل سند "سنّت" کو قرار دیا جاتا ہے۔ اور "سنت" مشتمل ہے ان تاریخی اور روایاتی حوالوں پر جن کا تذکرہ سابقہ صفحات میں ہمارے سامنے آچکا ہے۔ (مثال کے طور پر) رجم کی سزا نصِ صریح قرآن کے خلاف ہے۔ اسے مطابقِ اسلام قرار دینے والے تاریخی سندات سے ایسا کرتے ہیں۔ قرآن کو کوئی پوچھتا تک نہیں۔

آپ نے کبھی اس پر غور کیا ہے کہ اس صورتِ حالات کا نتیجہ کیا ہے؟ اسے ہم اپنی سابقہ اشاعت (بابت اپریل سنہ ۱۹۸۱ء) میں تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔ اس مقام پر اس کے اساسی نکات کو دہرایا جاتا ہے۔

(۱) مملکتِ پاکستان کا وجود اس لئے عمل میں لایا گیا تھا کہ اس میں اسلام اپنی منزہ شکل میں روبعمل ہوسکے۔

(۲) اس سے اقوامِ مغرب کو (خواہ وہ نظامِ سرمایہ داری کی حامل تھیں اور خواہ اشتراکی نظام کی) خطرہ لاحق ہوا کہ اگر اس مملکت میں قرآنی نظام قائم ہو گیا تو اس کے سامنے ان کے کسی نظام کا چراغ جل نہیں سکے گا۔ اس لئے انہوں نے خیر اسی میں سمجھی کہ قرآنی نظام یہاں قائم نہ ہونے پائے۔ اس کا آسان ترین طریقہ یہ تھا کہ اُس اسلام کو حقیقی اسلام مشہور کر کے اسے اجاگر کیا جائے جو ہمارے دورِ ملوکیت میں وضع ہوا تھا اور جس کی سندات تاریخ سے ملتی ہیں۔ اسے (FUNDAMENTALISM) کی تحریک کہا جاتا ہے۔

(۳) ان سندات کا پہلا نتیجہ تو یہ ہے کہ کوئی متفق علیہ نظام یا ضابطۂ قوانین مرتب ہو ہی نہیں سکتا۔ اس سے علاوہ اس کے کہ یہ ملک مستقل خلفشار کی آماجگاہ بنا رہے گا، دنیا میں یہ تأثر عام ہو جائے گا کہ اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے جو کسی زمانے میں تو زندہ قوت تھی لیکن اب روبعمل ہو نہیں سکتا۔ اس تأثر کے تحت مسلمان قومیں سیکولر نظام کی طرف آنے پر مجبور ہو جائیں گی۔

(۴) اور اسلام کے نام سے اس طرح کے قوانین مرتب کئے جائیں جنہیں دیکھ کر ہماری نوجوان نسل نفسِ اسلام ہی سے برگشتہ ہو جائے۔ (جیسا کہ قرآن کریم نے آیت ۵/۱۰۲ میں متنبہ کیا تھا) آپ ریفرنڈم کرائیے اور قوم کے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ سے پوچھئے کہ وہ ان قوانین کے متعلق کیا کہتے ہیں۔ ان کا جواب بتا دے گا کہ خود نفسِ اسلام کے متعلق وہ کس مقام پر پہنچ چکے ہیں، وہ محض معاشرہ کے دباؤ کی وجہ سے اسے زبان پر نہیں لاتے، ورنہ وہ دل میں اس سے منحرف ہو چکے ہیں، یا ہوتے جا رہے ہیں۔ ہم رونا روتے رہتے ہیں کہ پاکستان میں سوشلزم (بلکہ کمیونزم) سیلاب کی طرح اُمڈے چلا آرہا ہے۔ یہ صحیح ہے، لیکن ہم اتنا نہیں سوچتے کہ ایسا ہو کیوں رہا ہے؟ بادنیٰ تعمق یہ حقیقت اُبھر کر سامنے آجائے گی کہ کمیونزم کو ہم خود آوازیں دے دے کر بلا رہے ہیں۔ مشہور فلاسفر پسکال نے لکھا ہے کہ

انسانی ذہن اپنی فطرت سے مجبور ہے کہ وہ کسی نہ کسی چیز پر ایمان رکھے۔ وہ جب خدا پر ایمان چھوڑ

دیتا ہے تو شیطان کی پرستش کرنے لگ جاتا ہے۔ (انسان نے کیا سوچا؟ صفحہ ۳۳۹)

ہم اپنے نوجوانوں سے (مار مار کر) خدا پر ایمان چھڑا رہے ہیں۔ اس کے بعد ان کے سامنے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں رہ جاتا کہ وہ "شیطان" کی پرستش کرنے لگ جائیں۔

اس طرح اقوام مغرب کی وہ اسکیم کامیاب ہو رہی ہے جس کا مقصد یہ تھا کہ

ہو نہ جائے آشکارا شرع پیغمبر کہیں!

کتنی گہری ہوتی ہیں ان قوموں کی اسکیمیں! ساری دنیا میں غلغلہ مچ رہا ہے کہ اسلام کا ذبح ہو رہا ہے اور اس کیلئے یہ قومیں اپنے ممالک میں سامان و ذرائع اور سہولتیں اور آسائشیں مہیا کر رہی ہیں۔ اس کے لئے ہم ان کے ممنونِ احسان ہوتے ہیں، اور کبھی نہیں سوچتے کہ قصاب بکرے کو اس لئے پالتا ہے کہ اس نے اسے ذبح کرنا ہوتا ہے۔ اقبالؒ عمر بھر قوم کو ساحرینِ فرنگ کی اس سازش سے متنبہ کرتا رہا۔ لیکن اس کی کسی نے نہ سنی۔ ذرا سوچیئے کہ اس نے جب ابلیس کی زبان سے کہلوایا تھا کہ

یہ ہماری سعیٔ پیہم کی کرامت ہے کہ آج۔ صوفی و مُلّا ملوکیت کے بندے ہیں تمام (ارمغانِ حجاز)

تو کسی نے یہ نہ سوچا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے! انہوں نے اپنی عمر کے آخری ایام میں، زبان و شعر کے رمز و ایما کو بھی بالائے طاق رکھ دیا اور برہنہ حروف میں کہہ دیا کہ

مولوی کا ذہن پچھلے سو برس سے عقیم چلا آتا ہے۔ دیوبند کو دیکھئے۔ وہ بھی انگریزی شاہنشاہیت کی غیر ارادی تخلیق ہے۔ (اقبالؒ کے حضور۔ صفحہ ۲۸۲)

ان حضرات پر..... جو شور کرتے رہتے ہیں کہ دیوبند، اسلامی حکومت کے قیام کا مدعی چلا آ رہا ہے، علامہ اقبالؒ کی یہ حق گوئی گراں گذرے گی، لیکن اس کا کیا علاج کہ علماء دیوبند خود، اقبالؒ کی تائید کرتے ہیں۔ مولانا اسرار احمد آزاد دیوبندی علماء میں سے ہیں۔ انہوں نے ایک مقالہ میں جو ہندوستان کے مشہور نیشنلسٹ اخبار مدینہ (بجنور) کی ۷ار اپریل سنہ ۱۹۴۳ء کی اشاعت میں چھپا تھا، کہا تھا:۔

یہ الزام بے بنیاد ہے کہ علماء ہند اس ملک میں اسلامی حکومت کے لئے کوشاں رہے ہیں۔ دارالعلوم دیوبند سے تعلق رکھنے والے علماء نے کم از کم اس صدی کے آغاز سے ہندوستان میں جمہوری اور سیکولر حکومت کے قیام کو اپنا واضح العین قرار دے لیا تھا۔

یہی اقوام مغرب کا منشاء تھا۔

اس زمانے میں اسلامی تعلیم کا سرچشمہ صرف دیوبند تھا۔ آج قدم قدم پر "دیوبند" کھلے ہوئے ہیں۔ نیازی (مرحوم) نے لکھا ہے کہ حضرت علامہؒ نے یہ الفاظ انتہائی کرب و اذیت کے عالم میں اکھڑی اکھڑی سانس سے ___ بمشکل ادا کئے تھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اقوام مغرب کی اس سازش کے احساس سے ان کا قلب کس قدر مضطرب تھا۔ چالیس بیالیس سال پہلے کی بات ہے۔ آج وہ سازش کس قدر عریاں حقیقت بن کر سامنے آ رہی ہے۔ ؏

طبِ مغرب میں مزے میٹھے، اثر خواب آوری۔

اِن اقوام کے ہاتھوں ہم بُری طرح مات کھا گئے، اور ہمارے ہاتھوں اسلام مات کھا رہا ہے: خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ط ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ٥ (۲۲/۱۱) خدا کسی کو اس کا تماشا کرنا نہ دیا ہے نہ دیں۔

اِس کا توڑ صرف قرآن کی ضربِ کلیمی ہے۔ اس میں مشکل یہ ہے کہ اس سے پہلے قرآنی نظام کے داعی کو اپنے ہاں کی مذہبی پیشوائیت کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ لیکن اب اُن کی پشت پر اقوامِ مغرب بھی ہیں۔ اس لئے اُسے ان دونوں کا مقابلہ کرنا پڑے گا جو بڑا صبر آزما ہوگا۔ یہ فرعون اور ہامان دونوں کے خلاف اعلانِ جنگ ہوگا۔ جس کے لئے کسی بڑے باہمت مردِ مومن کی ضرورت ہوگی۔ ؎

عشق نبرد پیشہ طلبگارِ مرد ہے

(۷)

آخر میں ہم دو ایک ایسے اعتراضات کا ذکر کرنا ضروری سمجھتے ہیں، جو اس باب میں عام طور پر وارد کئے جاتے ہیں۔

(۱) کہا یہ جاتا ہے کہ اگر قوم میں پارٹیاں بنانے کی اجازت نہیں ہوگی، تو یہ (ONE PARTY GOVT) ہو جائے گی، جو ڈکٹیٹر شپ کا دوسرا نام ہے۔ سیکولر نظام میں ایک انداز یہ بھی ہے کہ اربابِ اقتدار قوم میں سے اپنی پسند کے افراد کو اکٹھا کر لیتے ہیں، اور زمامِ اقتدار ان کے ہاتھ میں دے دیا جاتا ہے۔ وہ قوت کے بل بوتے پر، باقی قوم پر حکومت کرتے ہیں، یہ یک۔ جماعتی نظام کہلاتا ہے جو واقعی آمریت ہے۔ لیکن قرآنی نظام میں یہ صورت پیدا نہیں ہوتی۔ اس میں اُمّت میں ایک پارٹی نہیں، بلکہ پوری کی پوری اُمّت شریکِ حکومت ہوتی ہے۔ قرآن میں مشاورت کا حکم پوری اُمّت کے لئے ہے۔ قرآنی نظام قائم کرنے والوں کا فریضہ ہوگا کہ وہ سوچیں کہ حالاتِ موجودہ، اِس مشاورت کی عملی شکل کیا ہوگی۔ یہ (ONE PARTY GOVT) گورنمنٹ نہیں، بلکہ (PARTYLESS) گورنمنٹ ہوگی۔ چونکہ ہم مغرب کے جمہوری نظام کے خوگر ہو چکے ہیں، اِس لئے اس قسم کی حکومت کا تصور ہمارے ذہن میں فِٹ نہیں بیٹھتا۔ اقبالؒ نے اِن حضرات کی اِس دشواری کے پیشِ نظر کہا تھا کہ ؎

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے   تیرے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیئے

یہ تو ہوئی مغرب زدہ ذہنیت۔ جہاں تک مذہبی ذہنیت کا تعلق ہے، اس کے متعلق اگلے شعر میں ہے ؎

وہ رمزِ شوق کہ پوشیدہ لا الٰہ میں ہے   طریقِ شیخ فقیہانہ ہو تو کیا کہیئے

(۲) دوسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ قرآنِ کریم کو سند اور حجت تسلیم کر لیا جائے، تو اس کی تعبیرات (INTERPRETATION) میں فرق ہوگا، اور اس سے قوم میں اختلاف پیدا ہو جائے گا۔ اِس قسم کا اعتراض کرنے والے قرآن کی حقیقت کو نہیں سمجھتے۔ پہلے تو یہ سمجھ لیجئے کہ اگر (جیسا کہ معترضین کا خیال ہے) قرآن واقعی ایسی کتاب ہے جس کے احکام کی تعبیرات میں اختلاف۔۔۔ ہو سکتا ہے تو اس سے اس کے منجانب اللہ ہونے کا دعویٰ ہی باطل قرار پا جاتا ہے۔ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ٥ (۴/۸۲)۔ اگر یہ خدا کی کتاب نہ ہوتی، کسی اور کی ہوتی

تو اس میں بہت اختلافات پائے جاتے۔ اس کے منجانب اللہ ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ قرآن میں عدم اختلاف کے معنی یہ نہیں کہ اس کے متن میں کسی قسم کا اختلاف نہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے دعاوی اور احکام میں کوئی اختلاف نہیں۔ تعبیرات یا استنباط میں اختلاف خود کتاب کا اختلاف ہوگا۔

قرآنِ کریم نے بہ حیثیت مجموعی اصولی احکام دیئے ہیں، اور اسے اسلامی مملکت پر چھوڑا ہے کہ وہ اپنے طریق وضع کرے جن کے مطابق ان اصولی احکام پر عمل کیا جائے۔ حالات کے اختلاف سے ایک ہی حکومت، پچھلے سابقہ اختیار کردہ قواعد و ضوابط میں تبدیلی کر سکتی ہے۔ اور بعد میں آنے والی حکومت بھی۔ یہ اختلافات، قرآنی احکام کی تعبیرات کا اختلاف نہیں۔ قرآنی احکام کے روبہ عمل لانے کے طریق کا اختلاف ہے۔ آپ مختلف فرقوں میں جو اختلاف دیکھتے ہیں، اس کی وجہ قرآن کی تعبیرات کا اختلاف نہیں۔ قرآن کو تو یہ حضرات درمیان میں لاتے ہی نہیں۔ انہوں نے کسی سابقہ زمانے کے عملی طریق وضوابط کو غیر متبدل اسلام قرار دے رکھا ہے، اور ہر فرقہ اس کا مدعی ہے کہ اس کے اختیار کردہ قوانین شریعت "کتاب و سنت" کے مطابق ہیں۔ ایسے سطحی بین لوگ قرآنی احکام کی تعبیرات [illegible] اور یہ اعتراض جڑ دیتے ہیں کہ قرآن کی تعبیرات مختلف ہو سکتی ہیں۔ جب اسلامی حکومت قرآن کو سند و حجت قرار دے کر اس کے احکام و اصول کو نافذ کرنے کے طرق و اسالیب اختیار کرے گی، تو یہ قرآن کی تعبیرات نہیں ہوں گی۔ اس کے احکام کی تنفیذ کے مختلف طریقے ہوں گے۔ یہ طریق اُمت کے باہمی مشورہ سے طے ہوں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ خود اسلامی حکومت امت کے مشورہ سے قائم ہو گی۔

قرآن کریم میں مشاورت کی دو آیات آئی ہیں۔ اور ان دونوں کے مفہوم میں بڑا لطیف اور عمیق فرق ہے۔ ایک آیت میں نبی اکرمؐ سے کہا گیا ہے کہ وَ شَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ..... (۳/۱۵۹) اور دوسری آیت میں امتِ مسلمہ کے متعلق ہے کہ وَ أَمْرُهُمْ شُورٰى بَيْنَهُمْ ۔ (۴۲/۳۸) الفاظ دونوں آیتوں کے ایک جیسے ہیں

لیکن ان الفاظ کی ترتیب میں جو فرق ہے وہ بڑا معنی خیز ہے۔ "امر" کے معنی امورِ مملکت یا حکومت ہیں..... رسول اللہؐ سے کہا گیا ہے کہ آپ امورِ مملکت کے بارے میں جماعتِ مومنین سے مشورہ کیا کریں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ مملکت خود حضورؐ نے قائم فرمائی تھی۔ حضورؐ اس کے سربراہ تھے لیکن آپ کی یہ سربراہی اُمت کے مشورہ سے عمل میں نہیں آئی تھی۔ منصبِ رسالت کی حیثیت سے حضورؐ اس کے اوّلین سربراہ تھے۔ جب اُمت کو مشاورت کا حکم دیا گیا تو کہا گیا کہ ان کی مملکت، حکومت، باہمی مشاورت سے قائم ہو گی۔ یعنی اسلامی حکومت کا قیام (سربراہِ مملکت کا انتخاب) بھی مشورہ سے ہو گا اور پھر جملہ امورِ مملکت بھی مشورہ سے طے پائیں گے۔ اس کی وضاحت حضرت عمرؓ نے ان الفاظ میں فرمائی تھی کہ لا خلافۃ الا عن مشورۃ ۔ "کوئی مملکت جو مشورہ کے بغیر قائم ہوئی ہو، خلافت (اسلامی) نہیں کہلا سکتی۔" (کنز العمال) دوسری جگہ ہے: من بایع عن غیر مشورۃ المسلمین فانہ

لا بیعۃ لہ ؎۱ (تاریخ طبری)۔ جو شخص عام مسلمانوں کے مشورے کے بغیر کسی شخص کو امیر قرار دے کر بیعت کرے گا تو اس کی بیعت کالعدم قرار پائے گی۔ ان ارشادات سے دو باتیں واضح ہیں۔ ایک یہ کہ کوئی حکومت جو امت کی رضامندی اور مشورہ کے بغیر قوت کے بل بوتے پر مسلط کی جائے، اسلامی نہیں کہلا سکتی۔ اور دوسری یہ کہ بیعت صرف ایک پارٹی کی نہیں پوری کی پوری امت کی ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ خلیفہ اوّل حضرت ابوبکر صدیقؓ کا انتخاب تو سقیفہ بنی ساعدہ کے مختصر سے اجتماع میں عمل میں آیا تھا لیکن دوسرے دن تمام امت کے نمائندگان نے آپ کی بیعت مسجدِ نبویؐ میں آکر کی تھی جس میں مہاجر اور انصار سب شامل تھے۔

یہ ہے اسلامی حکومت کا مختصر سا ہیولیٰ۔ لیکن اسے قائم کرنے کے لئے بڑے اولوالعزم مردانِ مومن کی ضرورت ہوگی جو مذہبی پیشوائیت اور مغربی استعماریت دونوں کا مقابلہ کر سکیں۔

۱؎ بحوالہ اسلام کا نظامِ حکومت۔ از مولانا حامد الانصاری (مرحوم)۔ ص ۳۲۹

ایک مدت کے انتظار کے بعد عصرِ حاضر کی نہایت اہم تصنیف

نظامِ ربوبیت

(یہ پہلے ایڈیشن سے قطعی مختلف ہے)

آپ ایک عرصہ سے سنتے چلے آ رہے ہیں کہ اسلام، نہ نظامِ سرمایہ داری کا حامی ہے، نہ کمیونزم کا۔ اس کا اپنا منفرد معاشی نظام ہے جس میں نوعِ انسان کی مشکلات کا حل مضمر ہے۔ لیکن کسی نے یہ نہ بتایا کہ اسلام کا وہ معاشی نظام ہے کیا؟
مفکرِ قرآن، پرویز صاحب کی اس تصنیف میں نہایت وضاحت سے بتایا گیا ہے کہ:-

(۱) نظامِ سرمایہ داری کیا ہے؟ کمیونزم اور سوشلزم کے نظام کیا ہیں اور یہ کیوں ناکام رہ گئے ہیں۔

اِن کے برعکس

(۲) اسلام کا وہ معاشی نظام کیا ہے جو نوعِ انسان کی مشکلات کا اطمینان بخش حل پیش کرتا ہے۔ اس کی روشنی میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ:
★ مارکس نے کس طرح یہ اعتراف کیا کہ اس کا نظام ناقابلِ عمل ہے۔ ★ ماوزے تنگ کا فلسفہ اشتراکیت کی بنیادیں کس طرح ناستوار ہیں۔
★ ربوٰ (سود) کا مسئلہ کیا ہے اور اس کا حل کیا ہے۔ ★ زکوٰۃ کا قرآنی مفہوم کیا ہے۔

اس کتاب کے بعد آپ کو معاشیات کے موضوع پر کسی اور کتاب کی ضرورت نہیں رہے گی۔

کتاب آفسٹ کی چھپائی میں، ولایتی سفید کاغذ پر طبع ہوئی ہے — ضخامت سوا چار سو صفحات — سنہری جلد
قیمت فی جلد پچاس روپے — (علاوہ محصول ڈاک) ★ ملنے کا پتہ

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ لاہور ○ مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور